ابوعمار زاہد الراشدی

سود سے متعلق عدالت عظمیٰ کا فیصلہ

سپریم کورٹ آف پاکستان کے تین رکنی بینچ نے جسٹس ثاقب نثار کے ریمارکس کے ساتھ اس آئینی پٹیشن کو ناقابل سماعت قرار دے کر خارج کر دیا ہے جو تنظیم اسلامی پاکستان کے امیر حافظ عاکف سعید کی طرف سے ان کے وکیل راجہ ارشاد احمد نے دائر کی تھی۔ پٹیشن میں کہا گیا تھا کہ آئینی طور پر حکومت پابند ہے کہ وہ ملک میں سودی نظام کا جلد از جلد خاتمہ کرے، لیکن ابھی تک اس پر عمل نہیں ہوا۔ چونکہ عدالت عظمیٰ دستور کی محافظ اور اس پر عملدرآمد کی نگران ہے، اس لیے حکومت کو سودی نظام کے جلد از جلد خاتمہ کا پابند بنایا جائے۔ اس پٹیشن کے جواب میں جسٹس نثار ثاقب محترم کا ارشاد ہے کہ ہم سودی نظام کے خلاف ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نظام کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن چونکہ عدالت عظمیٰ اس بارے میں کیس وفاقی شرعی عدالت کو بھجوا چکی ہے، اس لیے اس کے فیصلے کا انتظار کیا جائے۔

عدالتی پراسیس کے حوالہ سے یہ فیصلہ یقیناً درست ہوگا جس سے انکار کی گنجائش شاید نہیں ہے، لیکن ملک کی معروضی صورتحال اور سودی نظام کی وسیع تر تباہ کاریوں کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے کہ قوم کو اس فیصلے کی توقع نہیں تھی تو یہ بات بے جا نہ ہوگی۔ سودی نظام قرآن وسنت سے متصادم، دستوری تقاضوں سے انحراف، اور بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی واضح ہدایات کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ ملکی معیشت کے لیے ناسور کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اور اب تو اس کی تباہ کاریوں کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جا رہا ہے حتیٰ کہ جن مغربی اقوام وممالک کی پیروی میں ہم نے سودی معیشت کو اختیار کر رکھا ہے وہ خود اس سے نجات کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

بین الاقوامی ادارے بلاسود بینکاری کی طرف بتدریج بڑھ رہے ہیں۔ لندن اور پیرس جیسے معاشی مراکز غیر سودی بینکاری کا مرکز بننے کے لیے بے چین ہیں اور روسی پارلیمنٹ میں اسلامی معیشت کو اپنانے کے لیے قرارداد پیش ہو چکی ہے۔ اس فضا میں ہمارا حال یہ ہے کہ ملک میں رائج سودی قوانین کو اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت، اور سپریم کورٹ آف پاکستان میں واضح طور پر دستور کے منافی قرار دیے جانے کے باوجود ان سے پیچھا چھڑانے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی۔ جبکہ سودی معیشت کے پیدا کردہ معاشی تفاوت اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ نے ملک کے عام آدمی کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ مگر گزشتہ دو عشروں سے ہماری عدالتوں میں سودی قوانین کے حوالہ سے آنکھ مچولی کا سلسلہ جاری ہے اور ہم سود کو لعنت قرار دیتے ہوئے بھی اس کا جوا اپنی گردن سے اتارنے کے لیے عملاً تیار نہیں ہیں۔

کرپشن اور سودی نظام ہماری معاشی بیماریوں اور مشکلات کی اصل جڑ ہیں لیکن قومی سیاست کے ماحول میں کرپشن سے نجات حاصل کرنے کے لیے جو آوازیں اٹھ رہی ہیں ان کے ساتھ سودی نظام کی خباثتوں کو شامل کرنے سے خدا جانے کیوں گریز کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ دیانتدارانہ تجزیہ کیا جائے تو سودی نظام کی تباہ کاریاں کرپشن کی ہلاکت خیزیوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں، لیکن سب کچھ جانتے ہوئے ہمارے بہت سے سیاستدان سودی نظام کے بارے میں کلمۂ حق کہنے میں حجاب محسوس کرتے ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ آف پاکستان میں سودی نظام سے متعلقہ تمام امور اور مباحث بار بار زیر بحث آ چکے ہیں اور ان کے بارے میں ماہرین کی آراء کے علاوہ ملک کی رائے عامہ کے حوالہ سے یہ رپورٹ بھی سب کے سامنے ہے کہ اٹھانوے فیصد عوام سودی نظام کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ اس لیے انہی مباحث کو پھر سے موضوع بحث بنانے اور بنائے رکھنے کی کوئی وجہ اس کے سوا سمجھ نہیں آ رہی کہ کسی طرح مزید وقت گزر جائے اور سودی نظام کی خونخوار جونکوں کو قومی معیشت کا خون زیادہ سے زیادہ چوس لینے کا موقع فراہم ہو جائے۔

ہم عدالت عظمیٰ کے فیصلے کو عدالتی پراسیس کے حوالہ سے درست سمجھ لیتے ہیں لیکن ایک بات کی طرف توجہ دلانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ دہشت گردی کی لعنت کو عام دستوری اور قانونی ذرائع سے کنٹرول کرنے میں کامیابی نہ پا کر اس کے لیے ایمرجنسی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے جسے بظاہر قومی سطح پر قبول کر لیا گیا ہے۔ جبکہ اس طریقہ کار کے تحت کیے جانے والے اقدامات کا بڑا حصہ عام قانونی اور عدالتی پراسیس سے بالاتر دکھائی دیتا ہے۔ اگر عدالت عظمیٰ اس سے متفق ہے تو ہمیں بھی اس پر اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جس طرح عسکری دہشت گردی ملک کے لیے تباہ کن ہے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خصوصی اقدامات اور طریق کار کو ضروری سمجھا گیا ہے اسی طرح سودی نظام بھی ''معاشی دہشت گردی'' سے کم نہیں ہے جس کے نقصانات اور تباہ کاریاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لیے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھی خصوصی اقدامات اور طریق کار کی ضرورت ہے جس کے بغیر نہ تو قومی معیشت کو سنبھالا دینے کی کوئی صورت نظر آتی ہے اور نہ ہی کرپشن کے خاتمہ کی مہم میں کامیابی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

ملک کے معاشی نظام کو صحیح خطوط پر استوار کرنا ہے اور کرپشن کو جڑ سے اکھاڑنا ہے تو اس کے لیے دیگر ضروری اقدامات کے علاوہ سودی نظام کا خاتمہ بھی اس کا ناگزیر تقاضا ہے جس سے ہمارے قومی اداروں کو صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن وسنت کے معاشی قوانین، غیر سودی معیشت اور خلافت راشدہ کی طرز کی رفاہی ریاست ہماری اصل قومی ضروریات ہیں جو سودی نظام وقوانین کے ماحول سے نکل کر ہی پوری کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ دستور کی محافظ اور اس پر عملدرآمد کی نگرانی عدالت عظمیٰ سے ہم یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ ملک وقوم کے مفاد میں ''روٹین ورک'' سے ہٹ کر بھی اس مسئلہ کا جائزہ لے گی اور قوم کو سودی نظام کی لعنت سے نکالنے کے لیے کردار ادا کرے گی۔

اسلامی نظریاتی کونسل اور جہاد سے متعلق عصری سوالات

گزشتہ ماہ کی انتیس تاریخ کو اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ ایک کانفرنس میں شرکت

کا موقع ملا جس کا عنوان تھا ''اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جہاد کی تعریف، قوت نافذہ اور اس کے بنیادی عناصر''۔ کانفرنس کی دوسری نشست میں کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی کی زیر صدارت کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع ملا جن کا خلاصہ نذر قارئین کرنے سے پہلے اسلامی نظریاتی کونسل کی سرگرمیوں کے حوالہ سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اسلامی نظریاتی کونسل ایک دستوری ادارہ ہے جس کا بنیادی مقصد حکومت اور پارلیمنٹ کو رائج الوقت اور مجوزہ قوانین کے حوالہ سے شرعی راہ نمائی فراہم کرنا ہے۔ چونکہ پارلیمنٹ دستوری طور پر اس بات کی پابند ہے کہ وہ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنا سکتی اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تمام رائج الوقت قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنائے۔ جبکہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن وسنت کے ضروری علوم سے آگاہی کی کوئی شرط دستور میں موجود نہیں ہے اس لیے دستور پاکستان میں ایک مستقل ادارہ کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس مقصد کے لیے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' تشکیل دی گئی تاکہ پارلیمنٹ اور حکومت قوانین کے قرآن وسنت کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اس سے راہنمائی حاصل کر سکیں۔

اس کونسل میں مختلف مکاتب فکر کے جید علماء کرام کے ساتھ ساتھ ممتاز ماہرین قانون بھی شامل ہوتے ہیں اور اس ادارہ نے اس سلسلہ میں اب تک جو کام کیا ہے اس کے وقیع اور معتبر ہونے کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ملک میں نظام اسلام کے نفاذ کے خواہاں کم وبیش تمام حلقے اس امر پر متفق ہیں کہ ملکی قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے اب تک کی جانے والی سفارشات کو دستور کے مطابق وفاقی اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی روشنی میں قانون سازی کر لی جائے تو پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا تقریباً نوے فیصد کام مکمل ہو جاتا ہے۔ مگر عملی صورت حال یہ ہے کہ کونسل کی بیشتر سفارشات حکومت کے سرد خانے میں پڑی ہیں اور انہیں متعلقہ اسمبلیوں میں زیر بحث لانے سے مسلسل گریز کیا جا رہا ہے۔ بلکہ سیکولر حلقوں کی طرف سے سرے سے اسلامی نظریاتی کونسل کی افادیت وضرورت کو ہی مشکوک بنانے کی مہم جاری ہے اور اسے منفی تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

ان حالات میں کونسل کے موجودہ چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی اس بات کے لیے کوشاں دکھائی دیتے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل متحرک رہے اور مختلف حوالوں سے حکومت کو نفاذ اسلام کے سلسلہ میں اس کی دستوری ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتی رہے۔ مولانا شیرانی کی بعض آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کا یہ جذبہ اور محنت بہر حال قابل قدر اور لائق تحسین ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کو اس کے دستوری کردار کے دائرہ میں متحرک رکھے ہوئے ہیں۔

آج کل مولانا شیرانی اس امر کے لیے کوشاں ہیں جس پر انہوں نے مذکورہ بالا کانفرنس میں بھی تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا کہ جہاد اور دہشت گردی کو جس طرح عالمی ماحول میں گڈمڈ کر دیا گیا ہے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں اسلامی تعلیمات اور جہاد کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور اسلامی تعلیمات کی رو سے جہاد کے اصل مفہوم اور دائرہ کار کے ساتھ ساتھ اس کی اتھارٹی اور قوت نافذہ کو دلائل کے ساتھ واضح کرنا علماء کرام کی ذمہ داری ہے۔ اس عمل میں اسلامی نظریاتی کونسل کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے آئین کے آرٹیکل

320 کی ذیلی دفعہ (الف) کا یہ پیرا پیش کیا کہ:

''مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) اور صوبائی اسمبلیوں سے ایسے ذرائع اور وسائل کی سفارش کرنا جس سے پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے اسلام کے ان اصولوں اور تصورات کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب اور امداد ملے جن کا قرآن پاک اور سنت میں تعین کیا گیا ہے۔''

دستور پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل کے اس کردار کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی یہ خواہش اور کوشش رہتی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل مسلسل متحرک رہے اور حکومت اور عوام دونوں کی علمی و عملی راہ نمائی کرے۔ اس پس منظر میں جہاد کی تعریف اور دیگر متعلقہ امور کے حوالہ سے مذکورہ بالا کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کی جس نشست میں مجھے اظہار خیال کی دعوت دی گئی اس میں مولانا مفتی محمد زاہد، ڈاکٹر محسن نقوی، ڈاکٹر خورشید احمد، مولانا شیرانی اور دیگر حضرات نے بھی خطاب کیا۔

راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

☆ قرآن کریم نے قتال کا لفظ تو ہتھیار کی جنگ کے لیے ہی استعمال کیا ہے مگر جہاد کے لفظ میں عموم ہے۔ قرآن کریم نے جہاد بالنفس کے ساتھ جہاد بالمال کا ذکر کیا ہے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''جہاد باللسان'' کو بھی اس کے ساتھ شامل کیا ہے۔ بلکہ غزوۂ احزاب کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح اعلان فرمایا تھا کہ اب قریش ہمارے مقابلہ میں ہتھیار لے کر نہیں آئیں گے بلکہ زبان کی جنگ لڑیں گے اور شعر و خطابت کے میدان میں جوہر دکھائیں گے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت ثابت بن قیسؓ جیسے نامور خطباء اور شعراء نے جہاد باللسان کا یہ معرکہ سر کیا۔

☆ جہاد کا ہدف کیا ہے؟ اس کے بارے میں بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ ارشاد ہماری راہ نمائی کرتا ہے کہ جہاد کا مقصد کسی کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں بلکہ اسلام کی پرامن دعوت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔ چنانچہ جہاد اسلام قبول کروانے کے لیے نہیں بلکہ اسلام کے فروغ میں رکاوٹوں کو ہٹانے کے لیے ہے۔ جبکہ میرا طالب علمانہ خیال یہ ہے کہ مغرب نے اپنے سسٹم اور کلچر کو درپیش خطرہ سے نمٹنے کے لیے پیشگی حملہ کا جو طریق کار اختیار کیا ہے اور جسے ''کونڈولیزا رائس کی تھیوری'' کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ بھی شاید اسی نوعیت کا ہے۔

☆ جہاد کا طریق کار اور ہتھیار وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اس لیے جہاد کے بارے میں کتابوں میں موجود راہ نمائی سے استفادہ کرتے ہوئے ہر زمانہ میں اس دور کے تقاضوں کے مطابق جہاد کے ہتھیار اور حکمت عملی اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ''صلوٰۃ الخوف'' ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے لیکن آج کے جنگی ماحول میں اس کو عملاً اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ آج کے حالات میں جہاد کی سطح، دائرہ، حکمت عملی اور ہتھیاروں کا انتخاب آج کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہی کیا جائے۔

محمد دین جوہر *

قانون اور حقوق نسواں

دو انسانوں کے درمیان ہر رشتے کے صرف دو ہی سرے نہیں ہوتے، بلکہ تین کونے ہوتے ہیں۔ تیسرے کونے پر اگر خدا ہو تو وہ رشتہ اخلاقی ہوتا ہے اور اگر ریاست ہو تو وہ رشتہ قانونی ہوتا ہے۔ قانونی ہوتے ہی انسانی رشتے کا ہر طرح کی اقدار سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی انسانی رشتہ بیک وقت قانونی اور اخلاقی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اخلاقی رشتوں کا اصل دائرہ خونی رشتے اور ہمسائیگی ہے۔ اچھی معاشرت انہی اخلاقی رشتوں سے وجود میں آتی ہے۔ اگر سارے انسانی رشتے قانونی ہو جائیں تو معاشرت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اخلاقیات معاشرے کا مسئلہ ہے اور قانون ریاست کا۔ ریاست گلی اور گھر کے دروازے تک پھیلی ہوتی ہے اور اگر ریاست بیڈروم میں بھی آ جائے تو اس کا مطلب ہے کہ اخلاقی معاشرہ ختم ہو گیا ہے اور قانونی معاشرہ قائم ہو گیا ہے۔ قانونی معاشرے میں انسانی رشتے مزاج اور مفاد کے تابع، اخلاق سے لاتعلق اور شائستگی سے پُر ہوتے ہیں۔ اخلاقی معاشرے میں ہر وقت نگہداری کی ضرورت نہیں ہوتی، اور اقدار اور کردار اہم ہوتے ہیں۔ قانونی معاشرے میں ''ریاستی نظر'' مسلسل اور مستقل ہوتی ہے، اخلاقی کردار غیر اہم، اور عوامی ساکھ اہم ہوتی ہے۔

حال ہی میں حقوق نسواں کے تحفظ کے لیے ایک قانون بنایا گیا ہے۔ اس طرح انیسویں صدی کے اوائل سے ہمارے لیے بننے والے جدید قوانین کی طویل فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہوا ہے۔ حقوق بھلے عورتوں کے ہوں بھلے مردوں کے، ان کی حفاظت کے لیے قانون سازی ایک خوش آئند امر ہے۔ لیکن جدید قانون سازی صرف حقوق کے تحفظ کا نام نہیں ہے۔ جدید قانون سازی انسان کے نئے حقوق بناتی ہے، یعنی گھڑتی ہے، اور پھر ان نئے حقوق کو طاقت سے تحفظ فراہم کرتی ہے۔ جدید حقوق انسان کے لیے نہیں ہوتے بلکہ انسان حقوق کے لیے ہوتا ہے۔ جدید ریاست کے عطا کردہ حقوقِ انسانی ایک سانچہ ہیں جن میں عام آدمی کو ڈھال کر شہری بنایا جاتا ہے۔ چیزوں کے نئے نئے ماڈلوں کے ساتھ حقوق کے بھی نئے نئے ماڈل سامنے آتے رہتے ہیں۔ نئے انسانی حقوق طاقت سے پیدا ہوتے ہیں، اقدار سے پیدا نہیں ہوتے۔ جدید معاشروں میں نئے سماجی رشتے پیدا کرنے کے لیے نئے حقوق بنائے جاتے ہیں اور ان کو طاقت سے نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ کام بنیادی طور معاشی نظام کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔

* مدیر سہ ماہی ''جی'' لاہور۔ mdjauhar.mdj@gmail.com

مغربی معاشرے میں جدید قانون سازی کا مقصد انسانی حقوق کا تحفظ نہیں تھا، بلکہ مذہب اور مذہبی اخلاقیات کے طے کردہ انسانی اور سماجی رشتوں کا خاتمہ اور نئے انسانی رشتوں کا نفاذ تھا۔ جدید قانون سازی سے ایسے نئے انسانی رشتوں کا تصور سامنے آیا جو سرمایہ داری نظام کے لیے مفید تھے۔ کنبے کا باقی رہنا ہر ہر صورت میں سرمایہ داری نظام کے پیداواری رشتوں کے قطعی خلاف تھا۔ سرمایہ داری نظام کی ضرورت تھی کہ معاشرے میں انسان فرد فرد ہو جائے تاکہ اس کا شکار آسانی سے کیا جا سکے۔ ایک دوسرے سے جڑا ہوا انسان سرمایہ داری نظام کو ہرگز قابل قبول نہیں ہوتا۔ سرمایہ داری نظام کا معاشی اصول ہے: ''ایک نوکری ایک پیٹ''۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سب سے موثر قانون سازی ہے۔ قانون سازی کرتے ہوئے ریاست کے کان اور دھیان سرمائے کی طرف اور نظر لوگوں پر ہوتی ہے۔ قانون سرمائے کے معاشی دباؤ اور ریاستی طاقت کو یک جا کر دیتا ہے اور اس طرح ایک ایسا بلڈوزر بنتا ہے جس کے سامنے ہمالیہ بھی ریت کا ڈھیلا ہے۔ جدید قوانین کی مدد سے مغربی معاشرے میں کنبے کو بالکل ہی مسمار کر دیا گیا اور معاشرہ ریاست میں ضم ہو گیا۔

مغرب میں حقوق نسواں کے لیے جتنی بھی قانون سازی کی گئی اس کا مقصد ازدواجی زندگی کا خاتمہ تھا۔ اگر پائیدار ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو جائے تو کنبہ از خود ختم ہو جاتا ہے، اور تمام انسانی رشتے قانونی ہو جاتے ہیں۔ اس ''کارنامے'' سے پورے معاشرے کے سماجی رشتے بدل جاتے ہیں، اور معاشرہ ریاست کا جزو بن جاتا ہے۔ اور مذہب کی جگہ از خود ختم ہو جاتی ہے۔ شادی دو چیزوں کا نام ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شادی نبھانی ہو تو اخلاقی ہے، توڑنی ہو تو قانونی ہے۔ مذہبی معاشرہ اول پہلو پر زور دیتا ہے اور جدید سوسائٹی دوسرے پہلو کو اہم سمجھتی ہے۔ ازدواجی معاہدے میں قانون سویا رہتا ہے اور شادی توڑنے کے وقت بیدار ہوتا ہے۔ معاشرے کے جن طبقات میں شادیاں ابھی چل رہی ہیں وہاں اخلاقی شعور غالب ہے اور شادیوں کے ملبے سے جہاں سوسائٹی بن گئی ہے وہاں ہر وقت حقوق اور قانون کی شقوں پر زور ہوتا ہے۔ اگر ازدواجی قانون سازی وافر ہو جائے تو یہ ادارہ ہی ختم ہو جاتا ہے جیسا کہ مغرب میں ہوا ہے۔ مغرب میں ازدواجی قانون سازی اس قدر ہے کہ شادی میں اخلاقی رشتے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ اب بچے پیدا کرنے اور ان کی کفالت کے لیے عورت کو شادی کی ضرورت نہیں اور نہ وہ مرد کی طرف دیکھنے کی محتاج ہے۔ اگر خوش طبعی کے لیے عورت مرد شادی کر لیں تو ان کی مرضی، لیکن یہ ضروری نہیں رہی۔ یہ ترقیاتی کامیابی مغربی معاشرے نے ازدواجی قانون سازی کے ذریعے سے ہی حاصل کی ہے اور اس میں اولاد اور والدین کا رشتہ بھی فنا ہو گیا ہے۔

ہمارے مولوی صاحبان کو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ جدید دنیا میں قانون سازی سرمایے کی سڑک بنانے کا اسٹیم رولر ہے۔ نسوانی حقوق اور ازدواجی قوانین کا بنیادی مقصد ہی کنبے کا خاتمہ تھا جس میں کامیابی اب مکمل ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں معاشرے مغربی ہوئے ہیں، وہاں بھی کنبے کا مکمل خاتمہ ہو گیا ہے۔ جدید ریاست کی قانون سازی مذہب کے مطابق یا خلاف نہیں ہوتی۔ یہ مولوی صاحبان کی نہایت ہی بڑی خوش فہمی اور غلط فہمی ہے کہ جدید ریاست مذہب کے ''خلاف'' کوئی قانون پاس کرتی ہے۔ یعنی مولوی صاحبان یہ سمجھتے ہیں کہ جدید ریاست مذہب کو کوئی اہمیت دیتی ہے،

اس لیے وہ اس کے ''خلاف'' قانون بناتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جدید سیکولر ریاست مذہب کو اتنی اہمیت بھی نہیں دیتی کہ اس کے ''خلاف'' قانون بنانے پر وقت ضائع کرے۔ جدید قانون سازی معاشرے کو ریاست میں ضم کرنے کے لیے ہوتی ہے اور ضمناً مذہب از خود ختم ہو جاتا ہے۔

ہمارے علما قانون سازی میں مذہبی اور غیر مذہبی کی بحث اٹھا کر اصل چیزوں سے توجہ ہٹا دیتے ہیں اور اس طرح وہ عین انہی قوتوں کو مضبوط کرتے ہیں جو مذہب کا خاتمہ چاہتی ہیں۔ ہمارے علما نے اس نئے قانون سے جو غیر مذہبی پہلو نکالا ہے، وہ نہایت مضحکہ خیز ہے۔ جدید ریاست مذہب کا از حد احترام کرتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے وہ دہریت یا ہم جنس پرستی یا کلچر وغیرہ کا بھی از حد احترام کرتی ہے۔ وہ قانون سازی کرتے وقت مذہب سے چھیڑ چھاڑ میں وقت ضائع نہیں کرتی۔ دراصل مذہب کے نمائندے نہایت نادان لوگ ہیں اور سمجھتے ہیں کہ نعرے سے کام چل جائے گا۔ نعرہ سنتے ہی جدید ریاست اپنی حکمت عملی تبدیل کر لیتی ہے، ایجنڈا تبدیل نہیں کرتی، اور وہ قانون سازی سے اس زمین ہی کو ختم کر دیتی ہے جہاں مذہب کا شجر اگتا ہے۔ مذہب کا شجر انسانی معاشرے میں اگتا ہے۔ معاشی قوتوں کی مدد سے جدید قانون سازی معاشرے کو سول سوسائٹی بنا دیتی ہے، اور اس طرح مذہب کا ٹنٹا ہی نکل جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس قانون کی چند شقوں کے ردوبدل سے اگر مذہبی طبقے کو خوش کر بھی دیا جائے تو وہ اس معاشی دباؤ کا کیا علاج تجویز فرمائیں گے جو کنبے کو تیزی سے ختم کر رہا ہے؟ ایسا سرمایہ دارانہ نظام جو کنبے ہی کو مٹائے جا رہا ہے کیا وہ تبدیل شدہ قانون کے بعد ''اسلامی'' قرار پائے گا؟ طاقت دراصل کینگرو کی طرح ہوتی ہے اور قانون اس کی جھولی کا بچہ۔ ہمارے علما کی گہری بصیرت یہ کہتی ہے کہ طاقت کے کینگرو سے بکری کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے مولانا حضرات قانون کی بہت بات کرتے ہیں، لیکن جو طاقت قانون بناتی ہے، اور جس معاشی قوت کو راستہ دینے کے لیے قانون بنایا جاتا ہے، ان کے بارے میں وہ کچھ کہنے کے روادار نہیں۔ بڑے امام صاحب کے ایک مشہور قول کا عین یہی مطلب ہے کہ سیاسی طاقت اور قانون کا یک منبع، یک استناد اور یک ہدف ہونا لازم ہے۔ اسلامی قانون کی موٹی موٹی شقیں ان پڑھ آدمی کو بھی معلوم ہوتی ہیں، اس کے لیے عالم ہونا ضروری نہیں۔ ضروری یہ ہے کہ جدید سیاسی اور معاشی طاقت کے نظام کو سمجھنے کے وسائل بھی فراہم کیے جائیں، اور قانون سے اس کا تعلق واضح کیا جائے۔ مذہبی قوانین کی بات اس تجزیے کے بعد ہی بامعنی ہو سکتی ہے۔

اگر ہم مذہب کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں عادلانہ سیاسی اور معاشی نظام کی بات پہلے کرنا ہوگی اور قانون کے بارے میں وعظ کو تھوڑی دیر کے لیے مؤخر کرنا پڑے گا۔ قانون ایک ذیلی اور ضمنی چیز ہے، کیونکہ جیسی سیاسی اور معاشی قوت ہوتی ہے، ویسا ہی قانون بناتی ہے۔ ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہٹلر، سٹالن، بش اور بلیر کی ریاست اگر حدود و تعزیرات کو نافذ کر دے تو کیا شرعی عدل کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں؟

محمد زاہد صدیق مغل*

خواتین کے تحفظ کا بل - اصل مسئلہ اور حل

پنجاب اسمبلی میں "خواتین کے تحفظ" کے نام پر جو نیا قانون پاس کیا گیا ہے اسے لے کر ہمارے یہاں کہ مذہب پسند اور لبرل طبقات میں فکری بحث ومباحثہ اور سیاسی رسہ کشی جاری ہے۔ اس قانون کی حمایت کرنے والوں کے خیال میں اس بل سے نہ صرف یہ کہ خواتین کو مردوں کے تشدد سے تحفظ فراہم ہوگا بلکہ خواتین کی ترقی میں بھی پیش قدمی ہوگی (جیسا کہ کچھ سیاسی احباب نے اسے خواتین کی ترقی کا بل قرار دیا ہے)۔ یہاں اختصار کے ساتھ ہم ان مفروضات کا ذکر کریں گے جن کی بنا پر یہ بل ہمارے سماجی حقائق کے ساتھ مطابقت اور ہماری تہذیبی اقدار کے تحفظ کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بل میں چونکہ نفس مسئلہ کی تشخیص ہی غلط کی گئی ہے لہذا اس کا نہایت غیر متعلق حل پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک متبادل تجویز بھی پیش کی جائے گی۔

خواتین کے تحفظ کا یہ بل پیش کرنے والوں کے دو مفروضے ہیں: (1) مار کھانے والی تمام خواتین یورپی خواتین کی طرح معاشی وسماجی طور پر خود مختار ہیں، یعنی شوہر کے خلاف اس قسم کی قانونی کاروائی کا فیصلہ کرنے اور پھر اس فیصلے کے سماجی نتائج بھگتنے کے لئے خود مختار اور تیار ہیں، (2) جو مرد اس قدر سفاک ہے کہ اپنی بیوی کو بری طرح مارتا ہے، بیوی کی طرف سے پولیس کے حوالے کئے جانے کے بعد وہ بیوی کو خوشی سے گھر میں بسا کر رکھے گا، اور اگر طلاق دے کر فارغ کر دے گا، جو تقریباً یقیناً کر دے گا، تو ریاست ایسی بے سہارا خواتین کو کھچا کھچ دارالامان میں بھرتی کر لیا کرے گی۔ گویا یوں ایک بیوی کو ایک محفوظ اور باوقار زندگی میسر آ جائے گی۔ دھیان رہے، یہ دارالامان عوام کے ٹیکسوں سے چلائے جائیں گے۔ یہ ادارے کیسے "چلتے" اور "چلائے جاتے" ہیں یہ امر بھی اہل نظر پر کچھ مخفی نہیں۔

اہم تر سوال یہ ہے کہ کیا اس سب سے ایک "بیوی" محفوظ ہوگی یا برباد؟ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ قانون ایک "بیوی" کا تحفظ کرنے میں ناکام رہتا ہے؟ درحقیقت اس قسم کے ترمیمی بل جہاں ایک طرف مقامی زمینی حقائق اور معاشرتی اقدار سے سہو نظر کر کے مغربی طرز کے معاشروں کی نقالی پر مبنی ہوتے ہیں، دوسری طرف انہیں وضع کرتے وقت ان فلسفیانہ فکری مفروضات سے مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے جو اس قسم کے قوانین کے پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ مغرب میں نافذ العمل یہ قوانین "ہیومن رائٹس" کی ایک مخصوص فلسفیانہ تشریح پر مبنی ہیں۔ حقوق کی تفصیلات طے

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اکنامکس S3H نسٹ یونیورسٹی، اسلام آباد: zahid.siddique@s3h.nust.edu.pk